© rasailojaraid.com

فلسفۂ علم اور قرآن

پر ایمان کی کہانی

یہ عربی کی ایک کتاب " قصة الایمان بین الفلسفة والعلم والقرآن " کے چند ابواب کا ترجمہ ہے، جو قسط وار شائع ہوگا۔ کتاب کے مصنّف عربی دنیا کے مشہور عالم دین الشیخ ندیم الجسر مفتی طرابلس وشمالی لبنان ہیں۔ موصوف نے یہ کتاب کہانی کے انداز میں لکھی ہے۔ ایک طالب علم جس کا مصنّف نے حیران نام رکھا ہے۔ اور اس کے باپ کا نام اضعف ہے، پشاور کے ایک دارالعلوم میں پڑھتا ہے۔ اتفاق سے اُس کا فطری رجحان فلسفہ کی طرف ہے۔ اُس کے اساتذہ اور ساتھی اُس کے، یہ کیا ہے۔ کیوں ہے اور کیسے ہے، ایسے سوالات سے ناراض ہوتے ہیں، اور اسے دارالعلوم سے نکلنا پڑتا ہے۔ طالب علم مذکور کے والد جو خود بھی اس منزل سے گزر چکے ہوتے ہیں، اپنے صاحبزادے کو ایک بزرگ کا پتا دیتے ہیں، جن سے انھوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی تھی۔ حیران بن اضعف اس بزرگ کے پاس سمرقند پہنچتے ہیں اور وہ انہیں زیر نظر کتاب املاء کراتے ہیں۔ (مدیر)

مجھے یہ کتاب کیسے دی گئی

خدا ان بچپن کے کھیل کے میدانوں اور جوانی کے ٹھکانوں کو سیراب کرے، جب ہم کافی عرصہ باہر رہ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی طرف واپس آتے ہیں تاکہ ہم انہیں ان آنکھوں سے دیکھیں جن پر بڑھاپے نے کمزوری کے بادل ڈال دیئے ہوتے ہیں، تو یہ ہمارے دلوں کو کس قدر شیریں بھی معلوم ہوتے ہیں اور کڑوے بھی۔ یہ ہمارے ان دلوں میں یادوں کا طوفان بپا کر دیتے ہیں جن میں اُنس، اشتیاق، افسوس، وحشت، غم، بے چینی، ناامیدی اور تسلّی کے درمیان کشمکش ہو رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس شیریں غم کے بھنور میں ہمیں اس بات میں لذت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنے نفوس پر اور ان پر جو ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ان لوگوں پر جو عنقریب ہم سے جدا ہونے والے ہیں، اس دُور دراز کے مسافر کی طرح روئیں جس کے عزیز دوستوں کی جدائی کی سوزش کو صرف یہ امید کم کرتی ہے کہ وہ اور ایسے عزیزوں سے ملاقات کرے گا جو دُور دراز ملک میں اس کے منتظر ہوں۔

عمر کی ان آخری منزلوں میں ہم اپنی نگاہوں میں زندگی کو نہایت قیمتی اور شیریں بھی پاتے ہیں اور نہایت معمولی اور کڑوی بھی۔ لہٰذا فنا ہو جانے کا خیال ہمیں مرعوب کر دیتا ہے اور تمام گزشتہ وقتوں کے مقابلہ میں اس وقت ہمیں اس بات کا زیادہ شعور ہوتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ پر جو دوامی، ازلی اور سرمدی ہے، ایمان رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ خدا جس نے ہم سے ایک اور زندگی کا وعدہ کیا ہے اگر وہ نہ ہوتی تو اس دنیا کی زندگی بے کار اور ظالمانہ ثابت ہوتی۔

میرے بچپن کے ٹھکانوں میں سے میرے شہر میں ایک ٹھکانا "جامع مسجد طینال" ہے جو آبادی کے آخر میں ہمارے معطّر و سحر آمیز باغوں میں سے ایک باغ میں ہے۔ اس میں میرے بچپن کی یادوں میں سے میرے لئے ہر عزیز چیز موجود ہے۔ یہ مجھے عیدوں کی صبح کی یاد دلاتا ہے جبکہ میرا باپ سورج طلوع ہونے سے پہلے ان مُردوں کی زیارت کے لئے آتا جو جامع مسجد کے پہلو میں مقبرہ میں مدفون ہیں اور ان کے پیچھے ہو لیتا۔ اس کے بعد وہ یہاں عید کی نماز ادا کرتا۔ اور یہ مجھے موسم گرما کی ان شیریں شاموں کی یاد دلاتا ہے جن میں مَیں مسجد کے صحن میں حوض اور کنوئیں کے درمیان درخت کے پاس کھیلا کرتا اور میرا باپ اپنے حجرہ میں بیٹھا ہوتا اس کے گرد شیوخ بیٹھے اس کی باتوں کو سننے ہوتے۔ انہیں غافل پا کر میں دوڑ کر باغ میں چلا جاتا اور اس کی باڑ میں سے مَیں ایک سرکنڈا توڑ کر اسے گھوڑا بناتا۔ نیز یہ مجھے اس منارہ کی یاد دلاتا جس کی دُہری اور پیچ در پیچ سیڑھی پر ہم مسجد کے صحن سے چڑھ کر جاتے تاکہ ہم ایک لمحہ کے بعد اپنے آپ کو حرم کے اندر پائیں۔ یہ مجھے اس بوڑھے مؤذن کی بھی یاد دلاتا ہے جس سے میں بضد ہوتا کہ مجھے لے کر منارہ پر چڑھے اور نماز کے وقت کے بغیر ہی اذان دے اور وہ پریشان ہوتا کہ مجھے کیسے دلاسا دے اور ٹالے۔ تا آنکہ مغرب کا وقت آ جاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یہ ٹھکانا مجھے میری والدہ کی یاد دلاتا ہے جس سے میں اس عجیب منارے، گہرے کنویں اور سرکنڈوں کی باڑ کا ذکر کرتا تو وہ مجھے سانپوں سے ڈراتی اور خادم سے اصرار سے کہتی کہ وہ مجھے نہ منارے پر چڑھنے دے اور نہ کنویں کے قریب آنے دے۔

یہ ٹھکانا مجھے ان سب کی یاد دلاتا ہے، جنہیں موت نے اپنے دامن میں لپیٹ دیا۔ خود تو چلتے ہوئے اور میرے دل میں وہ غم چھوڑ گئے جو ایّام اور سالوں کے ڈھیر کے نیچے گہرائیوں میں گھستے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب میں طیناں واپس آتا ہوں تو یہ غم میرے غمزدہ دل پر انگاروں اور لوہے کی انگلیوں سے حملہ کر دیتے ہیں۔

ایام اور سالوں نے ہمیں دُور پھینک دیا اور ہم محلہ اور جامع مسجد سے دُور ہو گئے اور آخر میں پورے شہر سے دُور ہو گئے۔ پھر مدّت کی مسافرت کے بعد لوٹے اور میرا شوق مجھے طیناں لے آیا۔ چنانچہ میں ایک دن عین دوپہر کے وقت جب وہاں کوئی نمازی نہ تھا، یہاں آیا۔ میں بچپن کے کھیل کے میدانوں میں اِدھر اُدھر پھرا اور تمام یادوں کو تازہ کیا اور اللہ نے جتنا چاہا میں رویا۔

اور میں اپنی خاموشی میں مستغرق تھا اور مجھے صرف اپنی ہچکیوں کی آواز سنائی دیتی تھی جو مسجد کے بلند گنبدوں میں گونج رہی تھی کہ مشرقی جانب کے حجرہ سے، جس کے قریب جانے سے میں بچپن میں ڈرا کرتا تھا ان قبروں کے خوف سے جو اس کے اندر تھیں، مجھے ایک آواز آئی۔ اس کے بعد اس دروازے سے ایک بارعب شکل کا سفید بال اور عجیب لباس میں بوڑھا نکلا اور میری طرف آیا اور سلام کرنے کے بعد میرے پاس بیٹھ گیا اور اس نے ایسی فصیح عربی زبان میں جس میں عجمی زبان کا اثر تھا کہا:۔ بھائی کیوں رو رہے ہو؟

میں نے کہا: میرے باپ اور میرے بچپن کے زمانہ کی اس مسجد میں کچھ یادگاریں ہیں۔

اس نے پوچھا: آپ کے والد کون ہیں؟ ابھی میں نے اپنے باپ کا نام ہی لیا تھا کہ اس کا بدن لرزنے لگا۔ اور آنسوؤں بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا: کیا آپ کے والد شیخ جسر ہیں؟

میں نے کہا: ہاں۔ اور آپ کون ہیں؟

اس نے کہا: میں دراصل مصر کا رہنے والا ہوں اور آل المائی کے ان لوگوں میں سے ہوں جو کچھ تو شام چلے آئے تھے اور کچھ حجاز۔ اور تقدیر میرے پردادا کو حجاز سے ہندوستان لے گئی اور انھوں نے وہیں اقامت اختیار کر لی اور میرا نام "حیران بن الاضعف پنجابی" ہے۔

میں نے کہا: آپ ہندوستان سے یہاں کیسے آئے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نے جواب دیا: میں ہندوستان سے نہیں بلکہ سمرقند سے آیا ہوں بلکہ درست بات یہ ہے کہ میں سمرقند کے ایک گاؤں خرتنک سے آیا ہوں۔

میں نے کہا: آپ اس قدر دور دراز علاقہ سے ہمارے شہر میں کیسے آئے اور اس مسجد میں آپ کیسے قیام کر رہے ہیں؟

اس نے جواب دیا: میں آپ کے والد کی زیارت کے لئے اس شہر میں آیا ہوں۔ اس پر میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ کیونکہ میرا والد تو مدّت ہوئی فوت ہو چکا تھا۔

اس نے کہا: آپ حیران نہ ہوں۔ میں حجاز جاتے ہوئے ان کی قبر کی زیارت کے لئے آیا تھا۔ نیز اس جامع مسجد کی زیارت کے لئے جس کی تعریف کر کے میرے استاد نے اس کی محبت میرے دل میں ڈال دی تھی۔ اور اس نے مجھے بتلایا تھا کہ آپ کے والد یہاں درس دیا کرتے تھے۔ یہاں کے نمازیوں نے مجھے اس کمرے کا پتا دیا ہے، جس میں آپ کے والد رہا کرتے تھے اور میں نے اس مسجد کو خرتنک کی اس مسجد کے بہت مشابہ پایا جس میں میں نے اپنی زندگی کے نہایت قیمتی اور شیریں ایام گزارے تھے۔ لہذا میں نے چاہا کہ میں حج کے دنوں سے پہلے یہاں کچھ دن گزاروں تاکہ میں ایسے شخص کی قیام گاہ میں جس نے میرے استاد کو اللہ کی راہ دکھلائی، علیحدگی میں اللہ کی عبادت کروں۔

میں نے کہا: جناب! آپ کے استاد کون ہیں؟

اس نے جواب دیا: شیخ ابوالنور موزون رحمہ اللہ جو سمرقند کے علماء میں سے ہیں۔

میں نے کہا: کیا آپ اپنا تمام وقت عبادت میں گزار دیتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: اس وقت تو ایسا ہی کرتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے میں اپنی گمراہی اور ایمان کا قصہ لکھا کرتا تھا۔ جو مجھے میرے استاد نے لکھایا تھا۔ اسی نے مجھے آپ کے والد کا تعارف کرایا۔

میں نے کہا: آپ کی گمراہی اور ایمان کا قصہ کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ میں عنقریب اگر اللہ نے توفیق دی تو اسے شائع کروں گا۔ اس کے بعد وہ شخص اُٹھ کر قبروں والے کمرے میں چلا گیا اور ایک بڑی کاپی لے کر آیا اور میرے سامنے رکھ دی۔

اور کہا: یہ شیخ موزون کے لکھائے ہوئے بیانات ہیں اور میں نے انہیں اچھی طرح اور بدون اضافہ کے نقل کیا ہے۔

میں نے کہا: یہ تو ایک بڑی کتاب ہے کیا آپ مجھے اسے گھر لے جانے کی اجازت دیتے ہیں تاکہ میں دو راتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں پڑھ کر اسے واپس کر دوں۔

اس نے کہا: کیا آپ ترکی اچھی طرح جانتے ہیں؟

میں نے کہا: ہاں خوب جانتا ہوں۔

اس نے کہا: میں آپ کو کتاب لے جانے کی اجازت دیتا ہوں بشرطیکہ مجھے یقین ہو جائے کہ آپ واقعی جسر کے بیٹے ہیں اور آپ میں اس کے پڑھنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔

میں نے کہا: میں اپنی نسبت کے صحیح ہونے کی تصدیق تو اسی صورت میں کرا سکتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں تاکہ لوگ اس کی گواہی دیں اور میں آپ کو والد کی کتابیں دکھاؤں۔

اس نے کہا: مجھے ان تمام چیزوں کی ضرورت نہیں لیکن بس صرف ایک سوال کرتا ہوں آپ کے والد کی سب سے عظیم کتاب کون سی ہے اور اس کا اہم ترین باب کون سا ہے؟

میں نے کہا: میرے والد کی مشہور ترین کتاب "الرسالۃ الحمیدیہ" ہے اور اس کا اہم باب وہ ہے جس میں اللہ کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے اور ملحد طبیعیین (نیچریوں) کا رد کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اہم باب ابتداء کتاب میں دیگر بحثوں میں جن کا تعلق اثبات نبوت کے ساتھ ہے اور آخر کتاب میں کچھ حکمت آموز کلمات کے نیچے دب گیا ہے۔ اسی لئے میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں ضروری بحث کو الگ کر کے اس کا خلاصہ علیحدہ شائع کروں۔

اس نے کہا: مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ واقعی شیخ کے بیٹے ہیں اور آپ اس امانت کے اٹھانے کے اہل ہیں۔ میں یہ کتاب آپ کو ہدیۃً دیتا ہوں کیونکہ اس میں آپ کے والد کی کتاب کا خلاصہ ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا اور اس میں میری گمراہی اور ایمان کا مکمل ذکر ہے۔ اسے لیں اور ترجمہ کر کے چھپوائیں اور لوگوں میں شائع کریں۔ اور میں آپ سے کوئی اجرت نہیں مانگتا لیکن اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے عمل کو خاص اپنی خوشنودی کے لئے بنا دے اور اس سے لوگوں کو بھی اور مجھے بھی جب میری وفات کا وقت آئے اور میرا عمل منقطع ہو جائے نفع پہنچے۔

چند دنوں کے بعد یہ شخص حجاز روانہ ہو گیا اور میں نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا اور چند سالوں میں مکمل کر لیا۔ پھر اتفاقاتِ زمانہ نے مجھے تاشقند پہنچایا اور میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ میں خرتنک پہنچ کر حیران بن اضعف سے ملاقات کروں اور ترجمہ کے بعد یہ کتاب اسے دکھاؤں اور امام بخاری کی قبر کی زیارت کروں۔ اس میں میری مدد میرے باپ کے دوست شیخ ضیاء الدین بابا خان نے کی، جو بزرگ اور صاحب مروت انسان تھے اور عابد،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زاہد ولی اللہ باباخان مفتی اکبر رحمہ اللہ کے بیٹے تھے جب انھوں نے خرتنک کی زیارت کی میری اس خواہش کو محسوس کیا تو وہ بڑی مہربانی سے میرے ساتھ سمرقند گئے اور پھر وہاں سے خرتنک۔ اور وہاں مسجد کے خادم سے معلوم ہوا کہ حیران بن اضعف فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے گئے تھے اور مکہ میں ان کی وفات ہوگئی۔ ہم نے امام بخاری کی مسجد کی زیارت کی اور ان کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا تو حیران بن اضعف کے بیان کے مطابق وہ واقعی جامع مسجد طیبال سے بہت مشابہت رکھتی ہے کیونکہ یہ باغوں کے درمیان الگ تھلگ واقع ہے۔ امام بخاری کی قبر ایک کھلے میدان کے اندر چھوٹے سے باغ میں وسیع سایہ دار درخت کے نیچے واقع ہے۔ یہ قبر اپنی اصلی حالت میں ہے نہ تو اس پر چونے کا پلستر کیا ہوا ہے نہ کوئی پردے ہیں اور نہ کسی قسم کی زیبائش۔ میں اس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوا جہاں حیران اور اس کا استاد پڑھا کرتے تھے۔ دیکھا تو اس کے بیان کے مطابق یہاں سے امام بخاری کی قبر نظر آتی تھی، میں نے اس میں نماز پڑھی اور حیران بن اضعف کے لئے رحمت کی دعا کی۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی یہاں تک کہ میرے ساتھی کو میرے رونے پر تعجب ہوا۔

اس طرح یہ کتاب مجھ تک پہنچی جسے میں حق امانت ادا کرتے ہوئے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رحمت خداوندی کا محتاج

عبداللہ ندیم بن حسین الجسر۔ مفتی طرابلس

شیخ موزون کی خدمت میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین وبعد۔

یہ کمزور بندہ اللہ کی رحمت کا محتاج حیران بن اضعف المائی البنجابی کہتا ہے جب میں پشاور کے دارالعلوم کا طالب علم تھا تو میرا متجسس نفس فطرۃً "معرفت" کا مشتاق تھا۔ ہر عجیب کی چیز کی طرف جھانکتا اور ہر نامعلوم چیز کی طرف گردن اٹھا کر دیکھتا۔ ہر چیز کی اصل اور حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے بحث کرتا اور اس کے سبب، علت، راز اور حکمت کو معلوم کرنا چاہتا۔ چنانچہ میری عادت تھی کہ میں اپنے استادوں اور ساتھیوں سے اس جہاں کے متعلق سوال کرتا کہ یہ کیا ہے؟ کب پیدا ہوا؟ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ کس نے پیدا کیا؟ اور اس نے اسے کیسے پیدا کیا۔ ان سوالوں کے جواب میں مجھے سوائے ڈانٹ ڈپٹ کے کچھ حاصل نہ ہوتا اور سوائے تمسخر کے کوئی جواب نہ ملتا۔ چنانچہ استاد میرے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہتے : یہ نہ تو علم کا طالب ہے نہ دین کا۔ یہ تو بے وقوف محض فلسفہ بگھارتا ہے۔ یہاں تک تمام ساتھی میرا تمسخر اڑانے لگے اور انھوں نے مجھے نظر انداز کر دیا اور استادوں کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر میرے بُرے نام رکھے یہاں تک کہ دار العلوم کی فضا باہمہ فراخی میرے لئے تنگ معلوم ہونے لگی۔

اس تمسخر سے میرا اصرار اور شک اور بھی زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ میرے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ جن حقائق کا میں طلب گار ہوں، انھیں فلسفہ کے بغیر نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ دین اور عقل اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میرے استاد فلسفہ سے نفرت نہ کرتے اور میرے ساتھ مل کر وجود کے راز کے متعلق عقلی بحث میں غور و خوض کرنے سے نہ بھاگتے۔ لہذا میں نے دین کے اسباق ترک کر دیئے اور فلسفہ کی کتابوں کی تلاش کرنے لگا۔ مگر مجھے اپنے ملک میں اس کی بہت کم کتابیں ملیں۔ میں انھیں بغیر اس کے کہ ان کو سمجھ سکوں پڑھتے لگا۔ دن بدن میری حیرت، شک، طول کلامی اور بحث و جدل بڑھتی گئی۔ میری حالت اسی طرح رہی تا آنکہ استاد مجھ سے مایوس ہو گئے۔ اور انھیں اس بات کا خطرہ ہوا کہ کہیں یہ مرض دوسرے ساتھیوں تک سرایت نہ کر جائے لہذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے دار العلوم سے نکال دیا جائے۔

یہ خبر میرے باپ پر بجلی کی طرح گری اور اس نے مجھے راہ راست پر لانے کے لئے اپنی ساری عقل اور شفقت استعمال کی اور مجھے فلسفہ کو ترک کر دینے اور علم دین کی طرف لوٹنے کی نصیحت کی۔ اور کہا کہ جب تعلیم حاصل کرنے کا زمانہ ختم ہو جائے گا تو مجھے اختیار ہو گا کہ جب چاہوں فلسفہ کی طرف صحیح طور پر متوجّہ ہو جاؤں۔ آخری بات جو انھوں نے مجھے کہی، یہ تھی۔ اے حیران! مجھ پر بھی اسی قسم کی حالت گزری ہے چنانچہ میرا نفس فلسفہ کی طرف مائل ہوا اور میں شک اور حیرت میں بہت آگے نکل گیا۔ لیکن بزرگ عارف باللہ استاد ابو النور الموزون السمرقندی نے جو بہت بڑے فقیہ جلیل القدر عالم عظیم فلسفی تھے۔ مجھے اس وقت اسی طرح نصیحت کی، جس طرح آج میں تمہیں نصیحت کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے یہ فرمایا تھا:۔

"فلسفہ ایک ایسا سمندر ہے جو دیگر سمندروں کی طرح نہیں، اس سمندر پر سوار ہونے والے کو اس کے ساحل اور کنارے پر خطرے اور گمراہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کی موجوں اور گہرائیوں میں امن و امان ہوتا ہے"۔

لہذا بیٹا! یہ ناقص اور تشویش آور پڑھائی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ تمہاری عقل اور ایمان کے لئے سخت خطرناک ہے۔

میں نے کہا: کیا عقل اور ایمان ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں؟

انھوں نے فرمایا: پناہ بخدا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں : تو پھر یہ عالمِ اساتذہ عالم اور اس کی پیدائش کے متعلق ہر عقلی بحث پر مجھ پر کیوں بگڑتے ہیں ؟

انھوں نے فرمایا : اکابر علماء دین نے شک کرنے والوں اور ملحدین کا ردّ کرتے ہوئے اس عقلی تنازع پر غور و خوض کیا ہے اور اس سلسلہ میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن طالب علم کے لئے فلسفہ سے اس قدر دلچسپی کو ناپسند کیا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں اس سے ایمان متزلزل ہو جاتا ہے ۔

میں نے کہا : لیکن ہمارے بھائی دیگر مدارس اور کالجوں میں فلسفہ اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح حقیقی علم جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ لہٰذا صرف دین کے طالب علموں کو فلسفہ میں پڑنے سے باز رکھنے سے کیا فائدہ ؟ حالانکہ دنیاوی علوم کے طلبہ کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم ہے اور جب ایک دن یہ لوگوں کو ہدایت کرنے اور فتوے دینے کے مرکز پر متمکن ہوں گے اور کوئی شخص انہیں ایسا شبہ پیش کرے گا جو اسے اس فلسفہ کی وجہ سے پیش آیا ہو جسے اس نے مجبوراً پڑھا تھا تو یہ لوگ کیا کریں گے ۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ اس دن میں بھی اسی طرح خاموش کھڑا رہوں جس طرح میرے اساتذہ آج میرے سامنے خاموش ہو جاتے ہیں اور سائل کو دھتکار دوں گا۔ اباجان ! کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ اس حالت کا جاری رہنا لوگوں میں الحاد کے زیادہ پھیلنے کا موجب ہوگا۔

فرمایا : یہ درست ہے مگر ہمارے شیخ موزون جیسا کہ میں نے تمہیں تبلایا ہے فرماتے ہیں فلسفہ پڑھنے والے کے لئے فلسفہ کی تھوڑی سی تعلیم کافی نہیں۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ مدارس کے اندر فلسفہ کی تعلیم اس قدر عام کر دی جائے کہ ہر طالب علم اور ہر شخص فلسفی بن جائے ۔

میں نے کہا : ہرگز نہیں لیکن فلسفے میں وسعت جو عام طلبہ کے لئے غیر ممکن اور غیر ضروری ہے، علماء دین کے لئے ضروری ہو گئی ہے بلکہ ان کے لئے واجبی اور بنیادی ہے تاکہ وہ حق کی طرف راہنمائی اور دعوت دینے کا کام، جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے، صحیح طور پر ادا کر سکیں۔

میرے والد نے تلخی سے سر ہلاتے ہوئے فرمایا : یہ درست ہے مگر کیا کیا جائے .... ؟

میں : کیا آپ کے شیخ موزون نے اپنا وعدہ پورا کیا ؟

فرمایا : انھوں نے وعدہ خلافی نہیں کی ۔ لیکن بڑھاپے میں ان کا میلان زہد کی طرف ہو گیا تھا۔ پھر وہ پنجاب سے کوچ کر کے اپنے وطن سمرقند چلے گئے تھے اور وہ آجکل سمرقند کے قریب خرتنگ نامی بستی میں امام بخاری کی قبر کے قریب ایک مسجد میں دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اللہ سے لَو لگائے ہوئے ہیں ۔

میرے والد نے مجھ سے یہ بات تو کہہ دی مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ انھوں نے مجھے اس دار العلوم سے جس کی طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مجھے واپس بھیجنے کا ارادہ کر رہے ہیں، بھاگنے کی راہ بتا دی ہے اور انھوں نے اپنے خلاف یہ فیصلہ کر لیا جبکہ وہ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے تھے کہ وہ عمر بھر میرا چہرہ نہ دیکھیں گے۔ میں لمبے سفر کے بعد پیدل چل کر سمرقند پہنچا اور خرتنک کی راہ دریافت کی اور لوگوں نے مجھے اس کا پتا بتا دیا اور یہ شہر سے دُور نہ تھی۔ لہٰذا میں وہاں تک پیدل گیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ چنانچہ جس طرح دیہاتی لوگ ایک اجنبی کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اسی طرح اس گاؤں کے بچے مجھے دیکھ کر دہشت زدہ ہوئے، میری خبر آدمیوں تک پہنچ گئی تو ان میں سے تین آدمی مجھے لینے کے لئے آئے اور بلا کر گاؤں کے بڑے کے پاس لے گئے جس نے میری آؤ بھگت کی اور پوچھا کہ میں کیسے آیا ہوں۔ جب اسے معلوم ہوا تو مسکرایا۔ تمہیں شیخ موزوں کی زیارت نصیب ہونا ناممکن ہے کیونکہ وہ پانچ سال سے زائد عرصہ سے ان باغوں میں جو امام بخاری کی مسجد کے گرد ہیں، تنہا رہتے ہیں اور وہ مسجد میں رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد ہی آتے ہیں اور پھر موسم گرما میں امام بخاری کی قبر کے قریب باغ میں اور موسم سرما میں ایک چھوٹے سے بالاخانے میں جو قبر کی طرف کھلتا ہے، سو جاتے ہیں۔ کوئی شخص ان کے پاس نہیں جا سکتا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کی ہے مگر انہیں کوئی راہ نہ ملی بلکہ ہم اس گاؤں والے خود بھی ان کے پاس نہیں جا سکتے۔ ہم ان کا کھانا مسجد کے خادم کے ذریعہ سے ان تک پہنچاتے ہیں جو اسے باغ کی باڑ میں ان کو دیکھے بغیر رکھ دیتا ہے۔

میں نے کہا: شاید اللہ تعالیٰ ان تک پہنچنا میرے مقدر میں کر دے جو میرے سوا دوسروں کے لئے مقدر نہیں ہوا۔ مجھے صرف آپ لوگوں سے یہ امید ہے کہ آپ میری اس بات میں مدد کریں اور کھانا پہنچانے کا کام میرے سپرد کریں۔ اس شخص نے کہا: یہ تو بہت معمولی بات ہے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں نے شیخ کی ٹوکری اٹھائی گاؤں کے بڑے نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ مجھے اس باغ کا پتہ بتا دے جہاں شیخ آتے ہیں۔ وہ شخص مجھے ساتھ لے کر آیا اور مسجد تک پہنچا گیا اور اس کے بعد اس نے مجھے باغ اور اس جگہ کا پتا دیا جہاں روزانہ کھانا رکھا جاتا تھا۔ میں نے باڑ کے قریب ہو کر ٹوکری اپنی جگہ پر رکھ دی اور پھر اس کے کنارہ کے ساتھ ایک کاغذ کا پُرزہ لٹکا دیا جس میں میں نے یہ کلمات لکھے۔

کیا.....؟ اور کون.....؟ اور کس چیز سے؟ اور کیسے.....؟ اور کہاں...؟

اور کب.....؟

اس کے بعد میں پیچھے آ کر ایک ٹہنیوں والے درخت میں چھپ گیا۔ میں وہاں اس لئے چھپا کہ جب شیخ آئیں تو میں انہیں دیکھ سکوں اور وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹہنیوں کے درمیان ایک بارعب چہرے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراز قد، جھکی ہوئی کمر، گندمی رنگ، عربی چہرہ، سیدھی ناک، پتلے رخسار اور ننگے سر والے ظاہر ہوئے اور باڑ کی طرف آئے اور ٹوکری کے پاس گئے۔ بس جب انھوں نے ٹوکری کو اٹھایا ان کی نگاہ کاغذ پر پڑی اور کاغذ کے مضمون کو پڑھا تو دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ اس کے بعد انہیں چکر آیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے میں ان کی طرف دوڑا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے کیا حتیٰ کہ میں نے انہیں بٹھا دیا۔ جب وہ ہوش میں آئے تو آنکھیں کھولیں اور دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر اٹک اٹک کر کہا: ڈرو نہیں، کھڑے ہونے میں میری مدد کرو۔ میں نے ان کی مدد کی اور انہیں لے کر باغ میں گیا۔ وہ نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ اپنا منہ دھویا اور آنکھیں بند کئے آرام کرنے لگے۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد رونے والے کی سی بھاری آواز سے میں نے انہیں تین بار لاحول و لا قوۃ الا باللہ کہتے سنا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

بٹیا تو نے مجھے پریشان کیا اور جس عجز و انکسار سے استغراق میں میں اللہ کی طرف متوجہ تھا تو نے اسے مختل کر دیا اور تو نے وہ حیرت و شک کے غم مجھے یاد دلا دیئے ہیں جن کے شر کو میں جھیلا کرتا تھا۔ خدا تجھے معاف کرے خدا تجھے معاف کرے۔ بٹیا تو کون ہے؟

میں: میں آپ کے قدیم پنجابی شاگرد عبداللہ الاضعف کا بیٹا حیران ہوں۔

وہ: خوش آمدید۔ تمہارے باپ کا کیا حال ہے؟

میں: وہ بخیریت ہیں

وہ: معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی اسی الجھن میں پڑ گیا ہے جس میں تمہارا باپ پڑا تھا۔

میں: ہاں! اسی نے مجھے آپ کا پتا دیا ہے اور آپ کی طرف رہنمائی کی ہے۔

اس پر شیخ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر پانی کی طرف نگاہ پھیر کر دیر تک اسے دیکھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر کہا: اے موجودہ نسل کے نوجوانو! خدا تم پر رحم کرے۔ تم طریق نقل سے مکتب ایمان اور طریق عمل سے مکتب ادراک کے حامل ہو۔ تم کچھ چھلکے دین کے اور کچھ فلسفہ کے چباتے ہو، جس سے تمہاری عقل میں یہ بات جم جاتی ہے کہ ایمان اور فلسفہ اکٹھے نہیں ہو سکتے اور دین اور عقل میں اتفاق نہیں ہو سکتا اور یہ کہ فلسفہ الحاد کا راستہ ہے۔ حالانکہ بٹیا حقیقت میں ایسی بات نہیں ہے بلکہ فلسفہ تو اس عقل کے طریقہ سے جس پر تمام کے تمام دین کی بنیاد ہے ایمان باللہ کا راستہ ہے۔ لیکن بٹیا! فلسفہ ایک ایسا سمندر ہے جو اور سمندروں کی طرح نہیں ہے اس کا سوار ساحل اور کنارے پر خطرہ محسوس کرتا ہے اور اس کی موجوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گہرائیوں میں ایمان اور امان ہے۔ اس سے قبل تمہارے باپ کو بھی میں نے یہی کہا تھا۔

میں شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے جھکا۔ اور جس تردد، حیرت اور شک کے عذاب میں میں مبتلا تھا اس کی ان کے پاس شکایت کی۔ انھوں نے دیر تک سر نیچا کئے رکھا، اور وہ ایک چھڑی سے جو ان کے ہاتھ میں تھی، مٹی پر نشان ڈال رہے تھے۔

پھر کہا: اے حیران! معاملہ اس قدر آسان اور سہل نہیں جیسا کہ تیرا خیال ہے بلکہ اس میں بڑی کوشش اور عرصہ دراز درکار ہوتا ہے۔ اور بیٹا تو میرے پاس اس وقت آیا ہے جبکہ میں قبر کے کنارے تک پہنچ چکا ہوں اس گاؤں میں تمہارا قیام کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: میرے پاس کوئی جگہ نہیں میں کل ہی یہاں آیا ہوں اور رات گاؤں کے سردار کے ہاں گزاری ہے جس نے میری آؤ بھگت کی ہے۔

انھوں نے کہا: اس شہر میں کرایہ کے مکانات نہیں ہیں۔ اور یہ بھی درست نہیں کہ تو اس شخص کے ہاں مہمان رہے۔ ابھی اٹھ اور گاؤں جا کر اپنے لئے بستر، توشک اور ایک بڑی کاپی خرید کر واپس آؤ اور مسجد میں سوؤ۔ ہم رات کا وقت درس کے لئے رکھیں گے کیونکہ اس وقت زیادہ سکون، زیادہ صفائی قلب اور زیادہ وسیع وقت ہوتا ہے رہا دن تو میں دن میں اپنی گوشہ نشینی نہ چھوڑوں گا اس لئے کہ اس زندگی کی لذتوں میں سے میرے لئے ان باغوں کے درمیان صبح سے سورج غروب ہونے تک صرف یہی ایک لذت رہ گئی ہے کہ الگ ہو کر اللہ کا ذکر کروں اور میرے بہجت و سرور کو صرف سخت سردی ہی خراب کرتی ہے اور وہ مجھے دیواروں کے درمیان مقید کر دیتی ہے۔ اچھا اب پھر ملاقات ہو گی اے حیران۔

اللہ کی تلاش کرنے والے

حیران بن اضعف کہتا ہے:

میں مغرب سے تھوڑا ہی پہلے مسجد میں اپنا بستر اٹھائے ہوئے آیا تو مسجد کو خالی پایا۔ وہاں صرف ایک بوڑھا آدمی تھا جو چراغ روشن کر رہا تھا۔ وہی صبح میرے ساتھ مسجد تک آیا تھا۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو میری طرف آیا اور سلام کرنے کے بعد میرا حال پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے مسجد میں رات گزارنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ علیحدگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں امام بخاری کے پڑوس میں اللہ کی عبادت کر سکوں ۔ اس سے وہ بوڑھا بہت خوش ہوا اور کہا۔ آپ بخوشی یہاں رہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ جس طرح شیخ موزون نے ہمیں اپنی صحبت سے محروم کر رکھا ہے آپ بھی اس طرح نہیں کریں گے۔ پانچ سال گزرے وہ بھی آپ ہی کی طرح یہاں رہنے آئے تھے پھر اسی طرح عبادت کے لئے ایسی مکمل یکسوئی اختیار کی کہ ہم انہیں کبھی بھی نہیں دیکھتے اس لئے کہ صبح ہوتے ہی بیشتر اس کے کہ میں گاؤں سے یہاں آؤں وہ جنگلوں کو نکل جاتے ہیں اور مسجد میں سورج غروب ہونے کے بعد ہی آتے ہیں اور وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص انہیں دیکھ پائے۔

میں نے کہا: کیا آپ مسجد کے خادم ہیں ؟ اس نے کہا کہ میں پچاس سال سے اسی مسجد کی خدمت کر رہا ہوں ۔ میں نے کہا کیا بات ہے کہ یہ مسجد نمازیوں سے خالی رہتی ہے۔ اس نے کہا: نمازی کہاں سے آئیں ۔ مسجد گاؤں سے دور ہے یہاں تو صرف مسافر یا امام بخاری کی قبر کے زائرین نماز پڑھتے ہیں۔ ہم نے جب نماز مغرب اور عشاء پڑھ لی تو اس بوڑھے نے مجھے پانی کی جگہ بتا دی اور مجھ سے کہا کہ جب ضرورت نہ رہے تو چراغ بجھا دوں اور اس کے جانے کے بعد دروازہ بند کر لوں پھر وہ مجھے الوداع کہہ کر گاؤں کو چلا گیا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد مسجد کا دروازہ بند کر دیا۔ جونہی شیخ نے دروازہ بند کرنے کی آواز سنی، اپنے چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے آواز دی۔ میں ان کے پاس گیا اور انھوں نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں نے اندر جا کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ انھوں نے مجھے مرحبا کہا اور میرا حال پوچھا اور پورا ایک گھنٹہ مجھ سے میرے باپ کی باتیں کرتے رہے ۔ پھر کہا: کیا تو کاپی لایا ہے؟ میں نے کہا: ہاں! ۔ انھوں نے فرمایا: میں لکھاتا جاتا ہوں اور تو اپنی اور میری دونوں باتیں لکھتے جاؤ تاکہ دن کے وقت تم اس پر نظر ثانی کر سکو میں نے تمہارے لئے "سوال و جواب" کا طریقہ اختیار کیا ہے کیونکہ یہ افہام و تفہیم اور بحث کے لئے آسان طریقہ ہے۔ اب تم اپنے سوالات پیش کرو۔

حیران ۔ جناب! میرے سوالات تو وہی ہیں جو میں نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرزہ پر لکھ کر آپ کو دیئے تھے ۔ مجھ میں ان کے دہرانے کی جراءت نہیں ۔

شیخ : تمہارے ان سوالوں نے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے، فلسفیوں کی نہیں بلکہ تمام لوگوں کی عقلوں کو مشغول کر رکھا ہے ۔ اور فلسفہ ہی ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا اس نے ہر سوال کا صحیح جواب پا لیا ہے یا نہیں۔ جب تو آخر تک پہنچے گا تو تجھے اس کا پتا چل جائے گا۔

اے حیران! فلسفہ ہر چیز کی حقیقت، انتہا۔ اصل اور غایت کو معلوم کرنا چاہتا ہے یہ صرف ظاہر پر اکتفا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کرتا بلکہ باطن تک گھس جانا چاہتا ہے۔ نیز یہ صرف اس جہان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جو کچھ اس کے بعد اور اس کے پہلے ہے سب کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس جہان کو کس پیدا کیا ؟ کس چیز سے پیدا کیا، کب پیدا کیا اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ خالق کیا ہے اس کی ذات کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی صفات کی حقیقت کیا ہے۔ یہ انسان کیا ہے۔ اس کی کیا حقیقت کیا ہے۔ اس کی عقل کیا ہے۔ اس کا ادراک کیسے مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ ادراک کس حد تک صحیح ہوتا ہے۔ خیر کیا ہے۔ جمال کیا ہے۔ خیر کیوں خیر ہے اور جمیل کیوں جمیل، اسی طرح کے دیگر لامتناہی سوالات ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ ہر چیز کے ابتدائی (اُولیٰ) اصولوں کو معلوم کیا جائے۔ اسی لئے تو فلسفہ کی تعریف میں کہتے ہیں:

اشیاء کی حقیقت میں غور کرنے کا نام فلسفہ ہے۔

نیز کہتے ہیں: ابتدائی اصولوں کا علم فلسفہ ہے۔

اس کے علاوہ اس کی اور تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔ لیکن میں اس کی تعریف یوں کرتا ہوں:

عقل کا تمام ابتدائی اصولوں کی حقیقت کو سمجھنے کا ارادہ کرنا فلسفہ ہے۔ تجھے عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ میں نے جو تعریف کی ہے، صحیح ہے۔

حیران: مولانا! علم بھی تو حقائق الاشیاء سے بحث کرتا ہے تو کیا علم فلسفہ سے الگ چیز ہے۔

شیخ: علم اور فلسفہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ علم صرف اس دنیا کے مظاہر، اس کے نظام اور قوانین کے مطالعہ پر اکتفا کرتا ہے۔ مگر فلسفہ دنیا کی اصل، اس کی علّت اور اس کی حقیقت کے متعلق بحث کرتا ہے۔ ایک طبیعی عالم بغیر اس کے کہ وہ مادہ کی اصل اور اس کے وجود کی علت کے متعلق سوچے، مادہ کی ظاہری طبیعت کے مطالعہ پر اکتفا کرتا ہے، اور ریاضی دان بدون اس کے کہ وہ مکان و زمان کے معنی کو سوچنے کی تکلیف برداشت کرے، علم ہندسہ اور حساب کے متعلق بحث کرتا ہے اور یہ دونوں اس عقل کی وساطت سے جو انہیں حاصل ہے بحث کرتے ہیں بدون اس کے کہ وہ اس عقل کی حقیقت اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی قدرت پر غور کریں۔ مگر فلسفہ ایک ہی آن میں مادہ کی حقیقت، اس کی اصل، اس کے وجود کی علّت، مکان و زمان کا مفہوم، عقل کی اصل وحقیقت اور یہ کہ عقل سلامت رو ہوتی ہے اور کہاں تک حقیقت کو سمجھنے کی قدرت رکھتی ہے، سمجھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی آن میں وہ اپنے مطالعہ اور بحث کے ذریعہ سے معقول اور عقل دونوں کو لے لیتا ہے۔

دنیا اور اس کی علت پر بحث کرنے سے فلسفہ وجود پیدا ہوتا ہے۔ عقل اس کی حقیقت اور قدرت پر بحث کرنے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسفہ معرفت اور خیر، جمال اور بدصورتی کی حقیقت پر بحث کرنے سے فلسفہ اقدار پیدا ہوتا ہے۔ ان بحثوں میں سے جن پر بسیط سے بحث کرنا مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے وہ اور بحثوں کو چھوڑ کر وجود اور معرفت کی بحث ہے۔

حیران: مولانا! ایک بحث کو چھوڑ کر دوسری بحث پر زور دینے کی وجہ میں نہیں سمجھ سکا۔

شیخ: اگر تو غور کرے تو زور دینے کی وجہ ظاہر ہے۔ وجود کی بحث، موجودات کی طبیعت، اس کی حقیقت، اصل اور علت کو لیتی ہے یعنی مخلوق اور خالق دونوں کو اور معرفت کی بحث ان تمام آراء کو لیتی ہے جو فلاسفہ نے معرفت کے حصول کی کیفیت، اس کے وسائل اور یہ کہ وہ کس حد تک صحیح ہوتے ہیں، بیان کئے ہیں۔ اور تمہارے جن سوالوں نے تمہارے دل کو مشغول کر رکھا ہے اور تجھے حیرت اور شک کے پنجوں میں ڈال دیا ہے۔ پہلی دو بحثوں میں ہی محدود ہو جاتے ہیں اور اقدار کی بحث سے جس میں حقیقت جمال قبح خیر او رشر وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے، اس کا کوئی تعلق نہیں۔

حیران: سچی بات تو یہ ہے کہ میرے دل کو مشغول کرنے والی تو صرف وجود کی بحث ہے۔ لہذا بحث معرفت میں پڑنے کی کیا وجہ ہے؟

شیخ: صرف مابعد الطبیعات کا مسئلہ جیسا کہ میں جانتا ہوں تمہارے دل و دماغ کو مشغول کئے ہوئے ہے مگر بحث معرفت کی روشنی کے بغیر اس کا مطالعہ ممکن نہیں کیونکہ ان متعدد آراء کا مطالعہ جو مابعد الطبیعات کے مسئلہ میں کہی گئی ہیں، اس وقت تک مکمل اور درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم معرفت کے طریقوں اور ان کے وسائل کا مطالعہ نہ کر لیں نیز یہ معلوم نہ کر لیں کہ یہ وسائل کہاں تک سچے ہیں اور ان میں اس حقیقت کا یقین حاصل کرنے کی کہاں تک قدرت ہے، جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔

حیران: تب تو معرفت کی بحث وجود کی بحث کی خادم اور مسئلہ مابعد الطبیعات کے بارے میں حق کے ادراک کا وسیلہ ہوئی۔

شیخ: حقیقت اسی طرح ہے۔

حیران: تب مسئلہ مابعد الطبیعات فلسفہ کا جوہر ٹھہرا۔

شیخ: واقعہ یہی ہے، فلسفہ اپنے جوہر میں ہمیشہ سے عبارت رہا ہے تلاش خداوندی سے اور آئندہ بھی رہے گا۔

اس کے بعد شیخ نے اپنے تکیہ کے نیچے سے ایک ضخیم کتاب نکالی اور فرمایا آؤ ہم شروع کریں۔ (مسلسل)

© rasailojaraid.com